رسائل و مسائل

جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان

سوال :۔ اطبا مجھے مطالعہ اور غور و فکر سے شدت کے ساتھ روکتے ہیں، اس لیے دل میں وفورِ شوق کے باوجود، ممکن ہے کہ کتب مشارٌ الیہا کا مطالعہ احقر سے نہ ہو سکے، اور نہ کتابیں اس وقت احقر کے پاس ہیں۔ اس لیے احقر دوبارہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ گرامی نامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست پاکستان کی سیاسی نوعیت کو ملوکیت اور آمریت سے متمائز کرنے کی خاطر اس کے لیے "جمہوریہ" کا لفظ پسند فرمایا گیا ہے۔ لیکن، میرے محترم! بعض باتوں میں اسلام کی مشارکت و مماثلت نہ صرف جمہوریت کے ساتھ ہے بلکہ خود آمریت کے ساتھ بھی ہے جس کا انکار حضرت بھی نہیں فرمائیں گے۔ اسی طرح اشتراکیت کو بھی جمہوریت کے ساتھ مشارکات ہیں، بلکہ اشتراکیت خود جمہوریت ہی کی ایک خاص شکل کا نام ہے۔ معہذا بیس تیس سال میں اس کی نوعیت دیگر سیاسی انواع سے متمائز ہو گئی اور اصطلاح بھی الگ بن چکی، اور مغربی جمہوریت بھی دو سو سال میں ملوکیت سے خوب متمائز ہو چکی۔ کیا اسلام جو اپنی بالکل آخری شکل میں شریعتِ محمدی کی صورت میں سوا نہ سال قبل منظرِ عام پر آ چکا ہے وہ بجمیع مشخصاتہ ولوازمہ ملوکیت، آمریت یا خود جمہوریت سے متمائز نہیں ہوا؟ یقیناً ہوا، جیسا کہ انسان مشارکت فی الجنس واللوازم کے باوجود دیگر انواعِ حیوان سے متمائز ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے تو جیسا کہ اشتراکی پروگرام کو ماننے والے روس اور چین کے لیے صرف اشتراکی روس اور چین کہنا کافی ہو سکتا ہے تو اسلامی پروگرام کو ماننے والے پاکستان کے لیے اسلامی پاکستان (مملکتِ اسلامیۂ پاکستان) کہنا کافی نہ ہو گا؟ اور کیوں دیگر انواعِ ریاست سے یہ ریاست متمائز نہ ہو گی۔

میرے محترم! اگر ہم نے پاکستان کے لیے جمہوریہ کا لفظ اس لیے پسند کیا کہ دنیا اسے پسند

کرے، کیونکہ دنیا میں آج جمہوریت مقبول عام ہو چکی ہے تو کیا کل جو اشتراکیت کا دور دورہ ہونے والا ہے (اور اگر کوئی دوسرا ازم پیدا ہو گیا تو ممکن ہے کہ خود آمریت ہی کا بول بالا ہو جائے) تو کیا مشارکت فی بعض لوازمہ کی وجہ سے اس وقت "اشتراکیۂ اسلامیۂ فلاں ملک" یا "آمریۂ اسلامیۂ فلاں ملک" کہنا مناسب ہو گا؟ کیا یہ ہمارے احساس کمتری یا مرعوبیت کا نتیجہ نہ ہو گا؟ کیا اس سے اسلام ایک ڈھکوسلا نہیں بن جاتا؟

میرے محترم! آپ کا یہ فرمانا کہ یہ ریاست مغربی طرز کی جمہوریہ نہیں ہے بلکہ جمہوریت کے اُن اصولوں پر قائم ہوئی ہے جو اسلام نے پیش کیے ہیں، مثلاً ہم کہیں کہ ہم مساوات، رواداری یا آزادی کے اُن اصولوں کو اپنی ریاست میں قائم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے متعین کیے ہیں — کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم اپنی ریاست میں جمہوری اصولوں ہی کو قائم کرنا چاہتے ہیں جو موافق بالاسلام ہیں، نہ کہ خود اسلام کو جو مشتمل بر مساوات، رواداری، یا آزادی وغیرہ ہے؟

خدارا اس مسئلہ پر ذرا اطمینان و سکون سے غور فرمادیں، مسئلہ بہت نازک ہے۔

جواب:۔ پوری عالمی فضا کو اگر آپ سامنے رکھیں تو اسلام کا نظام ایک جانی پہچانی چیز نہیں ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں کے ذہن بھی الجھتے ہیں۔ ایک اس وجہ سے کہ کتاب و سنّت کے اسلام کے اوپر مسلمانوں کی عملی تاریخ کے جو دسّے صدی بہ صدی رکھے جاتے رہے ہیں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی روش کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری تاریخ کے بے شمار ابواب پر ملوکیت چھائی ہوئی ہے۔ اور یہ سارے ابواب بھی "تاریخ اسلام" کے عنوان سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ مستشرقین اور عیسائی مشنریوں نے اسلام کے متعلق دنیا بھر میں پڑھا جانے والا جو مغالطہ انگیز لٹریچر پیدا کیا ہے اس کی تاخت سے کم ہی لوگ محفوظ ملیں گے۔ علاوہ بریں فلسفۂ سیاسیات اور تاریخ سیاسیات کے میدان میں نفس "مذہبی حکومت" (THEOCRACY) کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے، دنیا کا عام سیکولر ذہن اسے اُٹھا کر اسلام پر بھی چسپک دیتا ہے۔ اب جہاں آپ نے اسلامی حکومت کا نام لیا، فوراً ایک خاص مذہبی طبقے کے آمرانہ اقتدار کا تصور بندھ گیا — نہ صرف بین الاقوامی فضا میں بلکہ خود پاکستان

ہیں، اور نہ صرف غیر مسلموں میں بلکہ خود مسلمانوں میں! چنانچہ یہاں ایک مدت سے "اسلامی نظام" کی دعوت کے خلاف اب تک یہ دلیل دہرائی جا رہی ہے کہ یہ چند ملاؤں کی حکومت جمانے کی کوشش ہے۔

پس اسلام کے بارے میں شبہات اور غلط فہمیوں کی غبار آلود فضا دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نظامِ زندگی کا نظریۂ اساسی اور اس کے اصول اور اس کا تفصیلی تصوّر بالکل نکھر کر دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اندریں حالات اگر ریاستِ پاکستان کے تسمیہ میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اسے سنتے ہی یہ مغالطہ رفع ہو جائے کہ یہاں کسی خاص طبقے کی ڈکٹیٹرشپ قائم نہیں کی جا رہی تو یہ مناسب ہے اور حدیث کی اس تعلیم کے عین مطابق ہے کہ اپنے آپ کو مواقعِ ظن اور مواضعِ تہمت سے بچانا چاہیے۔

جب یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اسلام کا نظام بادشاہت، آمریت یا محدود مذہبی طبقے کے تسلّط کا متحمل نہیں ہے، بلکہ وہ اصولِ شورائیت پر کام کرتا ہے، یعنی اربابِ امر کے انتخاب، تفویضِ فرائض اور تصفیۂ اُمور میں مسلم سوسائٹی کو باہمی مشورے پر انحصار کرنا چاہیے، اور نصوص کی تعبیر اور اجتہادیات میں اسلام کے مفاد کے ساتھ عامۃ المسلمین کے مفاد و مصالح کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کے ان خواص کو موجودہ دَور کی زبان اور ذہنی فضا کے لحاظ سے کس طرح بیان کیا جائے۔ ایک شکل نئی اصطلاح وضع کرنے کی ہو سکتی ہے مگر یہ اسی صورت میں درست ہوتی جبکہ نئی اصطلاح پہلے سے وضع ہو کر دنیا میں، خصوصاً پاکستان میں اپنے مفہومِ خاص کے ساتھ جانی جا چکی ہوتی۔ ایسا نہیں ہوا۔ پھر دوسری شکل یہی رہ جاتی ہے کہ مروجہ الفاظ کو ضروری احتیاط کے ساتھ استعمال کر لیا جائے۔ یہی دوسری شکل پاکستان میں اختیار کی گئی ہے۔ "جمہوریۂ اسلامیہ" کے الفاظ جمہوریت کو دو اقسام میں بانٹ رہے ہیں، — ایک اسلامی، دوسرے غیر اسلامی (مغربی) — اور پھر یہ الفاظ پاکستان کے لیے جمہوریت کی اس خاص شکل کو پیش کرتے ہیں جو اسلامی ہے۔

واضح رہے کہ اصل نام انگریزی میں "اسلامک ری پبلک آف پاکستان" تجویز کیا گیا ہے۔ "ری پبلک" کا لفظ جمہوریت کے مقابلے میں مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ "جمہوریت" کا اطلاق وہاں ہو سکتا ہے جہاں

لازماً حاکمیت کا سرچشمہ عوام ہوں اور مجرد عوام کی مرضی اور ان کی خواہشات نظام زندگی کی تشکیل کریں۔ لیکن "ری پبلک" کے مفہوم کا دائرہ وسیع ہے، اس کا اطلاق ایسی ریاست اور ایسے معاشرہ پر بھی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد خدا کی حاکمیت کے تصور پر ہو، اور عوام بطور خود صاحب حاکمیت نہ ہوں، نہ ان کی مرضی اور ان کی خواہشات آخری فیصلہ کن طاقت ہوں۔ لیکن ری پبلک میں اتنی بات ضرور ہوتی ہے، عوام کی رائے اور عوام کے مفاد کو نظام حکومت کے کام کرنے میں دخل حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ روس اور چین کی ریاستوں کے لیے بھی اختیار کیا گیا ہے (سوشلسٹ سوویٹ ری پبلک آف رشیا، چائنا)۔ گویا نظام زندگی کی اصولی نوعیت "سوشلسٹ" کے لفظ میں بیان کی گئی ہے اور اس کے طریق عمل کو لفظ "ری پبلک" سے واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں نظام زندگی کی اصولی نوعیت لفظ "اسلامک" سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی "عوامیت" کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے لفظ "ری پبلک" اختیار کیا گیا ہے۔

مان لیجیے کہ اس اہتمام کے باوجود مغالطے کا کوئی نہ کوئی امکان سہی، لیکن اصطلاحات کا مفہوم مروجہ لغت ہی سے متعین نہیں ہوتا، بڑی حد تک ان کو معنی ایک ریاست یا معاشرے کا عملی نمونہ دیتا ہے۔ اگر فی الواقع ہم اپنے ملک میں جمہوریت کے انہی اصولوں اور طریقوں پر کاربند ہوں جو اسلام نے دیئے ہیں اور اپنے سیاسی نظام کو شروع ہی سے مغربی جمہوریت سے متمیز رکھنے کی فکر کریں تو پھر مغالطوں کا جو امکان سامنے آتا ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چند سال کے اندر اندر ہم اپنی اصطلاح کا امتیازی مفہوم عملی نمونے کی صورت میں دکھا کر کہہ سکیں کہ یہ ہے "اسلامی ری پبلک" یا "اسلامی جمہوریت"!

ہم نے عوام کی تربیت کے لیے جو لٹریچر فراہم کیا ہے اس میں سب سے پہلے اس فتنے کی بیخ کنی کر دی گئی ہے کہ مرعوبانہ ذہن کے ساتھ چلتے ہوئے نظاموں اور اصطلاحوں کو جوں کا توں لے کر انہیں "اسلامی" ثابت کیا جائے۔ خود لفظ جمہوریت کے مغربی مفہوم کے اثر سے دماغوں کو پاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ دوسری طرف جمہوریت کے اسلامی مفہوم کو نتھار کر پیش کر دیا گیا ہے اور صرف پیش ہی نہیں کر دیا گیا، عملاً ہمارا پاکستان گیر نظام جماعت اسی مفہوم کے مطابق کام کر رہا ہے۔

ہماری اس کوشش کا دائرۂ اثر جتنا جتنا وسیع ہوگا، از خود اسلامی جمہوریت کا صحیح تصور قائم ہوتا جائیگا۔ نیز پاکستان کے سیاسی نظام میں ہم اسی اسلامی تصور کو راسخ کرنے میں مصروف ہیں اور مصروف رہیں گے۔

آخری گذارش یہ ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات مختلف ادوار میں حسبِ ضرورت اختیار کیے جاتے ہیں اور مجرد یہ چیز کوئی نازک مسئلہ نہیں پیدا کرتی، قابلِ غور یہ چیز ہوتی ہے کہ اصل حقیقت میں تو کوئی تحریف نہیں ہو رہی۔ اصل حقیقت اگر جوں کی توں موجود رہے تو اس کے لیے پیرایہ ہائے بیان نت نئے اختیار کرنے پڑتے ہی ہیں! فکر کیجیے تو اس بات کی کیجیے کہ پاکستان میں عملاً جو نظام کام کرے وہ نقطہ بہ نقطہ اسلامی ہونا چاہیے۔ پھر اصطلاحات اس کے قامت پر خود ہی راست آجائیں گی!

وجودِ باری تعالیٰ سے متعلق وساوس کا علاج

سوال:۔ میں ایک گنہ گار مسلمان ہوں۔ مدتوں جہالت کی زندگی بسر کرتا رہا ہوں کچھ عرصے سے مجھ میں عبادت اور تلاوت کا شوق پیدا ہوا ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ساتھ ہی ساتھ میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے ہیں۔ میں انہیں دبانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ڈر ہے کہ اگر یہ شکوک دُور نہ ہوئے تو اس ادھیڑبن میں عبادت مجھ سے ترک ہو جائے گی اور پھر میں گمراہی کی طرف دھکیل دیا جاؤں گا۔ جو شبہ میرے دل میں بار بار پیدا ہوتا ہے اُسے میں زبان پر نہیں لانا چاہتا لیکن میں اسے محض اس لیے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ آپ مجھے مطمئن کر سکیں۔ سوال جو میرے دل میں رہ رہ کر اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے اور وہ کیسے وجود میں آیا ہے؟ آپ خدارا میری اس الجھن کو رفع کریں تاکہ میں اس کشمکش سے نجات پا جاؤں۔

جواب:۔ آپ نے جن سوالات اور شبہات کا ذکر اپنے خط میں کیا ہے اس طرح کے سوالات کا انسانی ذہن میں پیدا ہو جانا کوئی محال یا ناممکن امر نہیں ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور و فکر کریں تو آپ کو اس حقیقت کا بھی احساس ہو جائے گا کہ اس طرح کے وساوس صرف اس آدمی کو ہی لاحق نہیں

ہوتے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتا ہو، بلکہ ایک دہریے، متشکک اور منکرِ خدا کو بھی اسی نوعیت کے کچھ دوسرے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو انسان اس ہنگامۂ ہست و بود سے ماورا یا مافوق اس کے کسی خالق کے وجود کو نہیں مانتا یا اس بارے میں شک و تذبذب میں مبتلا ہے اس سے بھی چند سوالات بڑے زور سے اپنے جواب کا تقاضا کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ اس عالمِ وجود کی ابتدا کیسے ہوئی اسے وجود میں لانے کا اصل باعث اور اوّلین سبب کیا تھا اور نمو، حیات، مادہ اور توانائی جن کے لاتعداد مظاہر نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ان کا آغاز آخر کب اور کیسے ہوا اور کس نے کیا۔ بہرحال جہاں تک اس طرح کے سوالات کا تعلق ہے کسی نہ کسی شکل میں مومن و منکر ہر فرد بشر سب کو ان سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔

اب اگر ذرا سا مزید غور کیا جائے تو ہمیں اس امر کا بھی بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق اور اس کے خالق سے متعلق اس قسم کے سوالات کا کوئی معقول جواب اپنے فہم و ادراک اور اپنی سعی و اکتساب کے بل پر حاصل کر سکے۔ خالقِ کون و مکاں کی ذات و صفات سے متعلق تصورات تو خیر اور بھی اعلیٰ و ارفع اور بلند و برتر ہیں، اس لیے اُن کی غیر محدود وسعتوں کا تو محدود عقل و خرد میں سمانا اور بھی مشکل ہے، لیکن تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم اس سوال سے صرفِ نظر بھی کر لیں کہ کائنات سے الگ اور بالاتر کوئی ہستی یا طاقت اسے وجود میں لانے والی ہے یا نہیں۔ اور ہم کائنات کو موجود مان کر کے ہی سوچنا شروع کریں تب بھی مکان و زمان سے وابستہ بہت سے حقائق و تصورات ایسے ہیں جو کماحقہٗ ہماری ذہنی گرفت میں نہیں آسکتے۔ اور ان کے حدود کی وسعت و بے پایانی کا احاطہ کر لینا تو درکنار، ایک خاص حد سے آگے اُن کا تصور کرنے سے بھی ہم عاجز ہیں۔ مثلاً زمانے کی ابتدا و انتہا کے متعلق ہم کیا تصور کر سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا کیونکر اور کب ہوئی اور اس کی انتہا کہاں اور کیسے ہوگی۔ سورج، چاند، تارے، زمین اور دیگر اجرامِ فلکی جس فضا میں تیر رہے ہیں آخر اس کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں اور چشمِ تصور سے بھی اس فضا کی سرحد کے اُس پار جھانک کر کیسے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہاں کیا عالم ہے۔

اس طرح کی دو ایک مثالوں سے ہی یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے فہم و قیاس کی رسائی بالکل محدود ہے اور ہماری سوچنے اور سمجھنے کی طاقتوں پر ان کی فطری ساخت کے اعتبار سے ہی ایسی حد بندی عائد کر دی گئی ہے کہ ایک مرحلے سے آگے کا تصور ان کے لیے قطعاً ناممکن ہے۔ جب انسانی ذہن کی کوتاہی کا یہ حال ہو کہ وہ مخلوق کی حقیقت کا بھی کلی ادراک نہیں کر سکتا تو وہ خالق کی کنہ تک کیسے پہنچ سکے گا؟

خالقِ کائنات سے متعلق شبہات کا جہاں تک محض اضطراری وساوس کی حیثیت سے قلب میں در آنے کا تعلق ہے تو اس سے تو مومن محفوظ نہیں ہو سکتا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسے ایمان کی صریح علامت بتایا ہے۔ چور وہاں ضرور نقب لگاتا ہے جہاں سرمایہ موجود ہو، اس لیے جو دل دولتِ ایمان سے مالا مال ہے اُسے ناگزیر طور پر ایسے حملوں کا ہدف بننا پڑیگا۔ اس لیے ایسے خیالات کا دل میں آکر بس گزر جانا کوئی تشویشناک امر نہیں ہے، جو چیز موجبِ تشویش و باعثِ مواخذہ ہے وہ یہ کہ ایک مومن ان وسوسوں کو کوئی اہمیت اور وزن دے اور انہیں دل میں جاگزین ہو کر پلنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دے یا پھر سنجیدگی سے ان سوالات کو قابلِ حل سمجھ کر اُن کا جواب حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرے اور چار سُو ان کا چرچا کرتا پھرے۔ یہ طرزِ عمل ایک مسلمان کے لیے قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا جو تصور دیا ہے اگر وہ ہمارے ذہن نشین رہے تو ہم ایسا طرزِ عمل کبھی اختیار نہیں کر سکتے۔ قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان کے متقابل انسانی صفات پر قیاس کرنا محال ہے اور نہ ہی دونوں میں کوئی حقیقی مشابہت ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ انسانی صفات محدود ہیں اور خارجی و مادّی سہاروں کی دست نگر ہیں لیکن خدائی صفات مطلق، غیر محدود اور خارجی سہاروں سے بے نیاز ہیں۔ دیکھتے ہم بھی ہیں مگر ایک خاص حد تک اور ہماری بصارت کے بالفعل ظہور کے لیے آنکھ اور روشنی کی ضرورت ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ کی بصارت ان حدود و قیود سے بالاتر ہے۔

سنتے ہم بھی ہیں مگر ہمارا سننا کان اور ہوا کا محتاج ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی سماعت ان احتیاجات سے بے نیاز ہے۔ زندہ و موجود ہم بھی ہیں مگر ہماری زندگی اور وجود خارجی سہاروں کے بل پر قائم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اگر زندہ و موجود ہے تو فقط اپنے بل پر۔ وہ ایسا حیّ و قیوم ہے جو آپ سے آپ قائم ہے اور ہر چیز کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اپنے صحیح اور حقیقی معنوں میں ازلی و ابدی ہے۔ دائمی بقا و وجود اس کی ذاتِ سرمدی کا بنیادی خاصہ ہے۔ اس کی ابتدا و پیدائش کا سوال اٹھانا ضدّین اور نقیضین کو جمع کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ وہ خالق ہی کیا ہوا کہ جو دوسرے خالق کا محتاج ہو۔ اس بدیہی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر واضح فرمایا ہے کہ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ اور اس کی نہایت عمدہ اور دلنشین تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے کہ ھو الاوّل لیس قبلہ شیئ، ھو الاخر لیس بعدہ شیئ، ھو الظاھر لیس فوقہ شیئ، ھو الباطن لیس دونہ شیئ (وہ سب سے پہلے ہے اُس سے پہلے کچھ نہیں، وہ سب سے آخر ہے اُس کے بعد میں کچھ نہیں، وہ ظاہر ہے اس سے مافوق کچھ نہیں، وہ باطن ہے اس سے مخفی کچھ نہیں)۔

اب ہم آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند مزید ارشادات وساوس سے متعلق نقل کرتے ہیں جن سے انشاءاللہ آپ کی پوری تشفی ہو جائے گی۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست بہ صدورھا مالم تعمل بہ او تتکلم۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے میری امت سے دلوں کے وسوسوں کو معاف فرمایا ہے بشرطیکہ ان پر عمل یا گفتگو نہ کی جائے۔

عن ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاءہ رجل فقال انی احدث نفسی بالشیٔ لان اکون حممۃ احب الیّ من ان

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا میں اپنے دل میں ایسے خیالات محسوس کرتا کہ میں انہیں زبان پر لانے کی

انکلم به قال الحمد للہ الذی رد امرہ الی الوسوسۃ ۔

نسبت کو تلمہ ہوجانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے اس بات کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال الناس یتساءلون حتی یقال ھذا خلق اللہ الخلق فمن خلق اللہ فمن وجد من ذالک شیئا فلیقل اٰمنت باللہ ورسلہٖ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ سوال وجواب کرتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا ہے ، تو اسے کس نے پیدا کیا ہے۔ جو آدمی یہ دیکھے تو اُسے کہنا چاہیے کہ بس میں اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لایا۔

ایک دوسری مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ایسے موقع پر اللہ سے پناہ مانگو اور رُک جاؤ۔ اب جو شخص یہاں نہیں رُکے گا اور اپنے راہوار خیالی کی لگام نہیں تھامے گا ، وہ سوائے اس کے کہ ضلالت کی وادیوں میں حیران و سرگردان بھٹکتا پھرے اور کیا کرے گا۔

اسلامی نظام اور تجارتی چکّر

سوال ۔ تجارتی چکّر (TRAEE CYCLE) نظام سرمایہ داری کی بہت بڑی خامیوں میں سے ایک ہے ۔ اس مکروہ چکّر کا علاج ہمیں اشتراکیت کے پاس بھی نہیں ملتا۔ کیونکہ وہاں بھی ہمیں (SCISSORS CRISIS) جیسی چیزیں ملتی ہیں ۔ کیا اسلام اس کا کوئی حل پیش کرتا ہے ؟ تجارتی چکر کی لاتعداد تعبیروں میں سے اسلام کے نظریہ سے کونسی قریب ترین ہے ۔ یا اس بارے میں اسلام بالکل ہی کوئی جدا نظریہ رکھتا ہے ۔ اب اگر تجارتی چکر کا محرک صرف سود ہی تصور کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بے شمار محرکات میں سے صرف ایک پر بحث کر رہے ہیں ۔ ایک اسلامی اسٹیٹ میں بھی ، جہاں کہ سُود

نہیں ہوگا، اس چیز کے قوی امکانات موجود ہیں کہ لوگوں کی آمدنی پیداوار سے کم ہو، پیداوار ضرورت سے زیادہ ہو اور عوام بچائیں کم یا زیادہ بہ نسبت اس کے جتنا وہ کاروبار میں لگاتے ہیں۔ کیا ان تمام برائیوں کے پیچھے سود ہی کارفرما ہے یا کوئی اور FACTOR بھی ہے جو کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں تو موجود ہے لیکن اسلام کے معاشی نظام میں نہیں ہوگا۔ اور اگر فساد کی جڑ سود ہی ہے تو ایک اسلامی ریاست میں اسکو ختم کرنے کے عملی اقدامات کیا ہونگے اور آج کل کے صنعتی دور میں، جبکہ سرمایہ کو رہنمائی حاصل ہے، بکھرے ہوئے سرمایہ کو مرکوز کرنے کی کیا تدابیر ہونگی۔

جواب:۔ آپ کے سوال کے جواب کے لیے تو ایک پوری تصنیف درکار ہے۔ میں یہاں چند باتیں نہایت ہی اختصار کے ساتھ عرض کر دیتا ہوں۔

ہماری قوم کا بھی کچھ عجیب حال ہے جب بھی مغرب سے اسلام کے کسی نظریہ کی تائید ہو جاتی ہے تو لوگ اُسے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور پھر سمجھا یہ جاتا ہے کہ مغربی تہذیب میں بس یہی ایک بیماری ہے جس کو مغربی حکیم نے بیان کر دیا ہے اور اسلام کے شفاخانہ سے حاصل کی ہوئی دوائی کا ایک گھونٹ مغربی نظامِ اجتماعی کو بالکل تندرست و توانا کر دے گا۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ آج کل سُود کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ لارڈ کینز اور اس کے ساتھیوں نے سود کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا ہے، اس سے بعض مفکرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بس یورپ کے معاشی عدم توازن اور بحران کا واحد سبب یہی ہے اور اگر یہ کانٹا اس کے پہلو سے نکل جائے تو پھر مریض رُو بصحت ہوگا۔ مگر آپ یقین کریں کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے بعد بھی یورپ کا یہی حال رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو تنہا سُود اور نہ کوئی دوسرا ایک محرک اس تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ان کی حیثیت تو ذرائع کی سی ہے۔ جن کو مغربی تہذیب کے معماروں نے اپنی زندگی کی تعمیر میں استعمال کیا ہے۔ یورپ کی بربادی، اور اس کے ساتھ ہماری تباہی کا اصلی سبب وہ تملیکی ذہنیت (ACQUISITIVE MENTALITY) ہے جسے تہذیبِ جدید نے نہایت ہی شدت کے ساتھ اپنے پرستاروں میں پیدا

کیا ہے۔ سود تو اس ذہنیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ جب تک اس مادّہ پرستانہ ذہنیت کو بدل کر ایک خدا پرستانہ ذہنیت پیدا نہیں کی جاتی، حالات کا درست ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آپ جتنا غور کریں گے اتنا ہی اس حقیقت کو درست پائیں گے۔ یورپ کے نظامِ حیات کے بگاڑ کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے خدا کو چھوڑ کر "پونڈ اور ڈالر" کو اپنا رب تسلیم کیا ہے۔ اسی بنا پر اُس کے ہاں ذی روح انسانوں کی قیمت گر رہی ہے، مگر بے جان دھاتوں کی قدر بڑھ رہی ہے۔

(۲) دوسری چیز جس پر میں آپ کو غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں، وہ ماحول کی قوت ہے۔ ماحول کے بدل جانے سے فکر و نگاہ کے زاویے بدل جاتے ہیں اور اس طرح انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔ آپ کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ایک اسلامی سوسائٹی میں لوگ دولت کے پیچھے اس طرح خون پسینہ ایک نہیں کریں گے جس طرح کہ آج کر رہے ہیں۔ وہاں دولت نصب العین کے حصول کے بے شمار ذرائع میں سے ایک ذریعہ تو ہو گی مگر ہو گی بہر حال ایک ذریعہ، اور آج کی طرح یہ زندگی کی سب سے قیمتی متاع نہیں ہو گی۔

(۳) آپ کا اس سوال کے متعلق کہ رائج الوقت تجارتی چکر کے نظریات میں سے کونسا اسلام کے قریب ترین ہے میں صرف اسی قدر گذارش کروں گا کہ اسلام کا ایک اپنا الگ اور مخصوص نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے پہلوؤں پر پوری طرح حاوی ہے۔ قرآن و سنّت میں سے اس کے متعلق تو پوری رہنمائی ملتی ہے، مگر اس کے پرزے کچھ اس طرز کے نہیں کہ ہر مشین میں فٹ آ سکیں۔ مغربی تہذیب نے ایک خاص ذہنیت کے ساتھ ایک معاشی اور سیاسی نظام قائم کیا ہے۔ اب اس میں سے جو برائیاں اُبھر کر سامنے آئی ہیں اُن پر اُسی اپنے طرزِ فکر کے مطابق غور کیا گیا ہے اور پھر انہیں اسی کی تہذیبی روح سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام ان سب کو باطل قرار دیتا ہے ـــــ ان کے کُل کو بھی اور جُز کو بھی۔ (ع - ح)

خلافت اور وصیّت

سوال :- بخاری، کتاب المرضٰی کی ایک حدیث میں یہ الفاظ نبوی وارد ہیں :- ۔۔۔ اوردت ان ارسل الی ابی بکر وابنہ واعھد ان یقول القائلون او یتمنی المتمنون ثم قلت یابی اللہ ویدفع المومنون او یدفع اللہ ویابی المومنون (میں نے ارادہ کیا کہ میں ابوبکرؓ اور ان کے صاحبزادے کو بلاؤں اور وصیت کردوں۔ مبادا کہ بعد میں کچھ قیل قال ہو یا تمنا کرنے والے تمنا کریں۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ اور مومنین خود ہی اس معاملے کی مدافعت کرلیں گے) اس حدیث سے بعض لوگ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں وصیتِ استخلاف ثابت کرتے ہیں۔ کیا یہ استدلال صحیح ہے ؟

جواب :- اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کے حق میں وصیت کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ اسی مضمون کی اور متعدد روایات بھی موجود ہیں۔ ان سب سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دلی خواہش تھی کہ حضرت ابوبکرؓ ہی مسلمانوں کے خلیفۂ اول ہوں کیونکہ آپ اس منصب کے لئے ہر لحاظ سے احق تھے، لیکن آپ نے اس بارے میں وصیت کا حکم دینے میں ہمیشہ تامل فرمایا تاکہ شورٰی اور انتخاب خلیفہ کا اصول مجروح یا مضمحل نہ ہونے پائے۔ گویا کہ ان احادیث سے خلافت کے لئے وصیت، ولی عہدی یا نامزدگی کا اصول ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت وجانشینی کے بارے میں ایک رائے رکھنے کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امر کی صورت میں نافذ نہیں فرمایا بلکہ اس معاملے کو مشیّتِ ایزدی اور جمہور مسلمین کی عمومی صوابدید پر چھوڑ دینا پسند فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس بارے میں کوئی قطعی ہدایت یا وصیت فرمادی ہوتی تو پھر ظاہر ہے کہ ثقیفۂ بنی ساعدہ میں اس مسئلے پر سرے سے مشورے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی اور صحابہ کرام میں اظہارِ اختلاف ہی کیوں ہوتا ؟